⊙ ڈاکٹر منور امین
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان
⊙⊙ بختاور سلیم
ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان
⊙⊙⊙ انا مریم
ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

انوار احمد کے افسانوں میں مقامی معاشرت کی عکاسی

Abstract:

Anwaar Ahmad is a well-known personality of the modern Urdu fiction. He started his creative journey with Urdu short story writing. He has always been unique in fiction writing due to his sharp style, way of thinking and his political and social consciousness. He has written more than 40 short stories so far. Anwaar Ahmad got the leaven of his stories from his surroundings, environment and society of his region. The theme of his stories represents the local life and characters live a reflection of the local society. In short, Anwaar Ahmad interprets the local life and society in his stories. This article presents an anlytical study of his short stories in above mentioned context.

Keywords:

Short Stories, Academician, Sketch, Consciousness, Leaven, Local Society

کسی خاص خطے یا علاقے کے پیدائشی چاہے وہ جانور ہوں، پرندے ہوں، پودے ہوں یا لوگ مقامی کہلاتے ہیں۔ مقامی لفظ ''مقامیت'' سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی ہیں قائم مقام ہونا۔ اور معاشرت کے معنی رہن سہن کے ہیں۔ درحقیقت مقام پیدائش مقامیت کا پہلا مرحلہ ہے اور انسان کے پیدا ہونے کے بعد اس کی پرورش اور پرداخت کے لیے جن لوگوں، برادری، نظام تمدن، نظام معیشت و سیاست سے واسطہ پڑتا ہے وہ اس کا سماج اور معاشرہ کہلاتا ہے۔ معاشرت

بھی اسی طرح سے آبادی پر مشتمل ایک گروہ سے قائم ہوتی ہے۔ یہ لازم نہیں کہ معاشرے میں خاص مذہب یا قوم کے لوگ آباد ہوں البتہ مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگ مل کر اپنی مقامی معاشرت ضرور قائم کر لیتے ہیں۔ اسی لیے مقامی معاشرہ کسی خاص مقام یا علاقے سے منسوب ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے علاقے کی زبان مقامی زبان، ثقافت کو مقامی ثقافت اور اسی طرح سے مقامی اخبار، مقامی رنگ، مقامی حکومت، مقامی تعطیل، مقامی سیاست، مقامی آبادی، مقامی آدمی اور مقامی طرز زندگی سب مل کر مقامی معاشرت کو جنم دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مقامی معاشرت میں طرز زندگی، رسوم و رواج، امور سیاست، تہذیب وثقافت سمیت انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام معاشرتی موضوعات شامل ہیں۔ مقامی معاشرت کے حوالے سے ملتان کی بات کریں تو ملتان تاریخی لحاظ سے دنیا کے قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے جس کی تاریخ وادی سندھ سے جڑی ہے۔ وادی سندھ کے ابتدائی باشندے دراوڑ قوم تھی جو اس خطے کے حقیقی زمین زاد تھے۔ اس کے بعد آریا قوم کی یہاں آمد، ان کا رہن سہن، تہذیب و معاشرت پھر بالترتیب یونانی، عربی، غزنوی، غوری، خلجی، تغلق خاندان، لودھی، مغلیہ اور انگریز حکومت کے باعث عہد بہ عہد اس دھرتی کا معاشرتی رنگ بھی بدلتا رہا ہے۔ آنے والی ہر قوم اور حکومت نے ملتان کی مقامی زندگی پر تاریخی، سیاسی اور مذہبی لحاظ سے اثر ڈالا یعنی اس خطے کی مقامیت درحقیقت سماجی اور سیاسی صورتحال سے مربوط رہی ہے۔ بدلتے زمانے نے اس علاقے کی مقامی معاشرت میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ یہاں مقامی معاشرت کا مطالعہ ادب کے حوالے سے ہے تو اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مقامیت کس طرح ادب پہ اثر انداز ہوتی ہے؟ کسی بھی خطے میں ادب کی روایت وسعت مطالعہ سے جنم لیتی ہے۔ ایسے میں اہل ادب کتابی دنیا میں کسی بھی کتاب کا مطالعہ کریں، شاعری میں چاہے وہ ''دیوانِ حافظ شیرازی'' ہو یا نثر میں ''پیرس کا کرب'' ہو۔ کسی شاعر کی شاعری کے طلسم میں کھو جائیں یا پھر قدیم مقامی زبانوں کو جاننے کے لیے ''عہد نامہ قدیم'' کا مطالعہ کریں۔ قرآن مجید کو پڑھ کر اس کے اسلوب کو سمجھنے کی کوشش کریں یا چاہے دنیا جہان کے اساطیر کو سمجھنے کے لیے ''رگ وید اور پران'' کا مطالعہ کریں مگر جس وقت ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی مقامی ساخت اور زبان کے ساتھ مقامیت کا اثر لیے اپنے ہی لوگوں کے بیچ رہ کر بات کرتے ہیں۔ اپنے ہی لوگوں کے درد کو محسوس کر کے، اپنی دھرتی پہ کیے گئے ظلم و استحصال کو قلم بند کرتے ہیں۔ مقامیت کا ایسا اثر ادب کی دیگر اصناف میں دکھائی دے یا نہ دے مگر افسانہ نگاری میں واضح دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے مقبول ادیبوں میں ایک نام انوار احمد (۱) کا ہے جو اردو افسانوی ادب کے جدید افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنی خاص طرزِ فکر اور اسلوب کے تیکھے پن کی وجہ سے افسانہ نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انوار احمد کی زندگی کا بیشتر حصہ افسانوں کا مطالعہ کرتے، افسانے کی تخلیق اور پھر افسانوی ادب کے لیے محقق اور نقاد کے طور پر گزرا ہے۔ ایسے میں آپ کا سیاسی و سماجی شعور گرد و پیش کے حالات و واقعات کو افسانوی کہانیوں میں سمونے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مقامی زندگی اور معاشرے کو درپیش مسائل کہیں علامتی انداز میں، کہیں بیانیہ، خود کلامی اور طنز کی لپیٹ میں عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانوں کے موضوعات اور کہانی کے حوالے سے انوار احمد کی فکر و فن پہ بات کرتے ہوئے ڈاکٹر روبینہ ترین بھی کچھ ایسا ہی لکھتی ہیں:

''ہمارے مانوس گرد و پیش سے فضا، موضوع اور کردار اُن کہانیوں میں تحلیل ہو کر جذبوں

میں طوفان برپا کرتے ہیں۔روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا فقرہ انوار احمد کی تحریروں کا خاصا ہے اور اسی صلاحیت نے اُن کی تحریروں میں حسن ِ ایجاز اور اشاراتی معنویت بھر دی ہے۔ان کا افسانہ خواہ علامتی ہو، بیانیہ یا داخلی خود کلامی کی رو میں لکھا گیا ہو، قصہ پن کی خصوصیت اُس میں ضرور موجود ہوتی ہے جو کہیں بھی قاری کا تجسس اور دلچسپی ختم نہیں ہونے دیتی۔اپنے ساتھ ہونے والے کسی ظلم کو تو شاید وہ برداشت کر لیتے ہیں مگر بے نواؤں کے ساتھ یا اپنی مٹی کے ساتھ تعصب یا ناانصافی پر اُن کا ردِعمل بہت شدید ہوتا ہے۔کہانیوں میں طنز کی کاٹ مزاحمت کے حوالے سے ان کے سماجی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔''(۲)

ستر کی دہائی میں انوار احمد نے افسانہ لکھنا شروع کیا اور اس وقت انوار احمد کے سامنے افسانے کی پختہ روایت موجود تھی۔اردو افسانہ بھی فنی و فکری اعتبار سے ہر طرح کے حالات اور وقت کی ہر قسم کی کروٹ سے گزر چکا تھا۔اس وقت بطور قاری اور نقاد انوار احمد بھی اردو افسانے پہ اثر انداز ہونے والے تمام عوامل سے بخوبی واقف ہو چکے تھے بلکہ انوار احمد کا سیاسی و سماجی شعور یہ جان چکا تھا کہ فن کا حقیقی مقصد ابلاغ ہے۔اور ابلاغ کے ذریعے ہی مقامی لوگوں کو ان کی سنہری تاریخ سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔کسی انقلاب یا تبدیلی کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔اس مقصد کی خاطر انوار احمد نے افسانے کو ذریعہ اظہار بنایا اور مقامی زندگی و معاشرت کے پہلوؤں کو اپنی کہانیوں میں سمویا۔عوام کے سامنے مقامی خطے کی تاریخ کو لانے کی کوشش کی۔افسانہ ''نئی دنیا کی تلاش'' میں:

''اس نے دیکھا کہ معصوم انسانوں پر ہلاکت نازل کرنے والے مقتولین کے لہو سے ان کے جسموں اور پوشاکوں پر تہذیبی برتری کے نشان بنانے لگے۔کولمبس جونیئر نے اس واقعے کی رپورٹ پروفیسر بروس کو ان لفظوں میں دی۔'' آج کی رات میں نے ایک نئی دنیا تلاش کر تو لی ہے مگر میں خوش نہیں کیونکہ وہاں جو انسان تھے وہ ذبح کر دیئے گئے اور جو باقی بچ گئے ہیں انہیں انسان مانتے مجھے ڈر لگتا ہے''۔(۳)

درج بالا اقتباس بظاہر علامتی انداز میں لکھا گیا ملتان کی سیاسی صورتحال کے تناظر میں مقامی زندگی کی تباہ کاریوں کا عکاس ہے مگر لاشعوری طور پر افسانہ نگار نے یہاں مقامی لوگوں کو ان کی تلخ تاریخ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔کہ جب حملہ آوروں نے اس خطے کے لوگوں کو مار بھگایا تھا اور یہاں قابض ہو کر حکومت کرتے رہے۔ایسے میں افسانہ نگار بطور مقامی آدمی انہیں انسان مانتے ہوئے ڈرتا ہے۔

اسّی کی دہائی میں جب ملکی حالات سیاسی پیچیدگیوں کے باعث کروٹ لے رہے تھے اس وقت عام آدمی اور مقامی زندگی بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ایسے میں ادب برائے زندگی کے قائل ادیبوں نے زمانے اور حالات کو جیسا دیکھا، سنا اور بالخصوص جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے قلم کے ذریعے بیان کر دیا۔وہ زمانہ انوار احمد کی افسانوی تخلیق کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔معاشرتی سطح پر عدم اعتمادی، خوف، بے سمتی، داخلی شکست اور منافقت کا اثر لیے انوار احمد نے علامتی انداز اپنا کر ۱۵ سے زائد کہانیاں لکھیں جن میں مخصوص سماجی صورتحال کو اپنی فکر و فن کے سانچے میں ڈھال کر کہانیوں میں بیان کیا

گیا۔اس کے بعد اُن کے ترکی میں قیام کے دوران لکھے افسانوں میں بھی مقامی سطح پہ معاشرتی بدحالی کا ذکر ملتا ہے۔ افسانہ ''امیت کوے کی کہانی'' میں انوار احمد نے ملکی اور سیاسی حالات تک تناظر میں مقامی آبادی اور مقامی معاشرت کی بدحالی کا تذکرہ کیا ہے:

> ''پھر جاوید نے بتایا وہ اس بدقسمت خطے سے آیا ہے، جہاں حکمران امیر اور عوام غریب رہتے ہیں، البتہ جہالت، غریبی اور بیماری کا علاج نیوکلیئر توانائی سے کرتے ہیں، بھوکوں کے لیے پھانسی کے تختے پر گھاس اُگانے کی کوشش کرتے ہیں، ملت وکیل یعنی ارکان پارلیمنٹ جعلی ویزوں کا کاروبار کرتے ہیں، ماں باپ جوان ہوتی اولاد کو کبھی دعا اور کبھی بددعا دیتے ہیں نوجوان خفت زدہ ہو کر محبت کرتے ہیں تو اس میں نفرت اور منافقت خود بخود شامل ہو جاتی ہے اور جہاں کے نوجوانوں کو یقین آ گیا ہے کہ ان کا رزق، رشتہ اور رسم آخر اَن دیکھی زمینوں سے وابستہ ہے۔''(۴)

انوار احمد اپنی تحریروں میں مقامی آدمی کا ترجمان ہے۔ملتان کی مقامی آدمی کے حالات، رہن سہن اور محرومیوں سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔تبھی ہم انوار احمد کے افسانوں میں طرزِ زندگی کا بیاں مقامی ثقافت سے مشروط دیکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم مقامی لوگوں کو اس قدر حالات کا ستایا ہوا اور عدم تحفظ کا شکار محسوس کرتے ہیں جیسے اپنی دھرتی، وطن اور زمین پر خوشی کے بجائے مجبوری سے رہ رہے ہوں۔افسانہ ''انتظار میں ڈوبا ہوا گھر'' معاشرے کے متوسط نچلے طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتا بہترین افسانہ ہے جس میں مقامی طرزِ زندگی بالخصوص روزمرہ روٹین کو بیان کیا گیا ہے۔اس کہانی میں ایک طرف مقامی زندگی کے معمولات کی خوبصورت منظر نگاری ہے دوسری جانب رشتوں میں منافقت، دوری، بے نیازی اور خود پرستی کہانی میں دکھائی دیتی ہے۔افسانے کے پانچ کردار ہیں اور پانچوں بنیادی ضروریات سے محروم ہونے کے ساتھ معاشرے کے مختلف سماجی مسائل کا شکار ہو کر مجبوری کی زندگی گزار رہے ہیں۔

انوار احمد عصر حاضر کے ان تخلیق کاروں میں شامل ہے جن کی تحریروں کا بنیادی موضوع مقامی زندگی رہی ہے اور کہانیاں مقامی سیاسی حالات و واقعات کے زیر اثر تخلیق ہوئی ہیں۔ہم انوار احمد کی کہانیوں میں معاشرتی زندگی کی ترقی کو بھی دیکھتے ہیں کہ جب اکیسویں صدی کی شروعات میں معاشرے کے متوسط طبقے نے اپنا معیار زندگی بلند کیا اور اپنا طرزِ زندگی بدلا۔مقامی معاشرے نے جس طرح ترقی کی اسے افسانہ ''کفن سے انکاری'' میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔کہانی میں جدید ملتان شہر کی جدید زندگی کو عکس بند کیا گیا ہے۔

> ''یہ نسبتاً پرسکون کالونی مشہور تھی، یہاں کتابی علم رکھنے والوں کی رہائش تھی، وہ ضابطہ پسند لوگ تھے، محنت مشقت کر کے انھوں نے مطلوبہ تعلیمی ڈگری حاصل کی، قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری پر نوکری پائی اور شادی کی، کفایت سے بچے پیدا کیے محکمہ تقدیر کے جاری کردہ راشن کارڈ کے مطابق محبت کی، ہر حاکم کی اطاعت کی، نصابی کتاب، افسر اور بیوی کی نافرمانی کا خیال تک دل میں نہیں لائے، زیادہ تر شائستہ زبان بولی۔''(۵)

اس افسانے کی کہانی بیانیہ انداز میں اور طنز کی کاٹ سے مزین ہے۔یہ الگ بات ہے کہ کہانی کا اختتام رخ

بدل لیتا ہے مگر انوار احمد نے کمال مہارت سے اعلیٰ متوسط طبقے کی طرزِ زندگی اور معمولات زندگی کو ترقی پذیر دکھاتے ہوئے ان کے معاشرتی مسائل کی نشاندہی کی ہے۔

افسانہ ''آسٹروٹرف'' میں مقامی معاشرت کے حوالے سے انوار احمد نے ہجرت اور نقل مکانی جیسے مسئلے کا موضوع بنایا ہے۔ درحقیقت ہمارے معاشرے میں اہم مسئلہ ہجرت یا نقل مکانی کا نہیں ہے بلکہ بے روزگاری ہے جس کی وجہ سے مقامی لوگ ہجرت یا نقل مکانی پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ افسانے میں اس حقیقت کے ساتھ جنم لینے والے ایک اہم مسئلے کی طرف افسانہ نگار نے توجہ دلائی ہے جو مقامی زندگی میں ویرانی اور رشتوں میں دوری ہے۔ افسانے میں ایک طرف رشتوں کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ پردیس جا کر کمانے والے وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر وہیں اپنا گھر بسا کر اپنے وطن اور اپنی دھرتی سے ہمیشہ کے لیے نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ اس کہانی میں افسانہ نگار گھروں کی ویرانی اور گھر کے بڑوں کو اکیلا، منتظر دیکھ کر کشمکش و پیچ میں مبتلا ہے۔

> ''میرے گھر کے سناٹے میں اس کلاک کی ٹک ٹک گونج رہی ہے جو میرے بڑے بیٹے نے کینیڈا سے بھجوایا ہے اور میرے روبرو وہ ٹیلی ویژن پڑا ہے جو کل ہی میرے چھوٹے بیٹے نے ابوظہبی سے بھیجا ہے، کیا میرے سارے سفر کا حاصل یہی سرد ویران گھر ہے جہاں افراد کے بجائے اشیا سجی ہیں؟''(۶)

اس افسانے میں مرکزی کردار متکلم کی صورت میں خود افسانہ نگار ہے۔ معاشرے کے اس رویے کو قاری کے سامنے لایا گیا ہے کہ عام آدمی کی ذہنیت نے اس طرح کی طرزِ زندگی کو بطور احساس برتری قبول کر لیا ہے۔ مادیت پسندی اس حد تک مقامی معاشرت میں سرایت کر چکی ہے کہ آنگن کا ویران اور خالی ہونا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ لوگ اونچا اور عالیشان گھر دیکھ کر رشک کرتے ہیں ان کی آنکھوں میں حرص جاگتا ہے۔ معاشرے کا اعلیٰ طبقہ ایسے بڑے عالیشان گھر کے اکیلے بوڑھے مالک کو اپنی محفلوں میں بطور مہمان خصوصی بلاتا ہے اور پھر فخریہ انداز میں دولت مند ہونے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں پیدا ہونے والی اس صورتحال پہ انوار احمد نے افسردگی کا اظہار کیا ہے کہ معاشرہ رشتوں کے دور ہو جانے یا بے معنی ہو جانے کو اہمیت نہیں دیتا۔

> ''میں اس مسئلے پر جتنا غور کرتا ہوں، اتنا الجھتا ہوں، میرے سبھی جاننے والے میرے الجھنے سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہ مطمئن ہو کر کہتے ہیں کہ نقل مکانی یا ہجرت ایک سیدھا سادا اقتصادی مسئلہ ہے اور بس۔ مگر جانے میں کیوں مطمئن نہیں شاید اس لئے کہ میں اپنے دو بیٹے اس مسئلے کی بھینٹ چڑھا چکا ہوں، میں مضطرب ہوں، میں اپنے آنگن کی ویرانی کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔''(۷)

انوار احمد نے مقامی زندگی کے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے کرداروں کو کہانیوں میں سمویا ہے۔ اکثر افسانے ملتان کی مقامی زندگی اور معاشرت کی چلتی پھرتی تصویر کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ افسانوں میں معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان میں افسانہ ''کھڑکی کھلی رکھنا'' ہے جس میں مقامی آدمی کو درپیش گھر اور اولاد سے متعلق پریشانیوں میں گھرا اور مسائل کا سامنا کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ کہیں شادی کے لیے جہیز کا لازمی ہونا، کہیں سسرال میں بیٹی

کے ساتھ ظلم و زیادتی، کہیں شوہر کی دوسری شادی کے باعث طلاق کا مسئلہ، کہیں جوان اولاد کے گزر جانے کا دکھ اور کہیں شریک سفر کا وقت سے پہلے ابدی زندگی سدھار جانے کا غم وغیرہ۔ اس چیز کو ہم افسانہ ''جب راج کرے کی خلق خدا'' میں بھی دیکھتے ہیں جس میں جاگیردارانہ نظام کی عکاسی کی گئی ہے اور اس کے باعث ہونے والی عورتوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کو قلم بند کیا گیا ہے۔ معاشرے میں اب بھی جاگیردارانہ نظام کے تحت کچھ ایسے قدیم رواج مروج ہیں جن کے تحت بیٹی یا بہن کی شادی قرآن سے کر دی جاتی ہے یا پھر کسی محرم رشتے سے بیاہ دیا جاتا ہے تاکہ اس کے حصے یا نام کی جائیداد باہر نا چلی جائے۔

> ''۶ ماہ بہاولپور کی جیل میں سیاسی قید گزارنے والی پٹھانی اُٹھی اس کے ساتھ بتول بھی جس کی قرآن سے شادی کی گئی تھی، تاکہ جائیداد گھر سے باہر نہ جا سکے۔''(۸)

ملتانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم نے ساتویں صدی عیسوی میں جس راجہ داہر کو شکست دو چار کیا تھا اور سندھ فتح کیا تھا۔ اس راجہ داہر نے بھی اپنی سگی بہن سے شادی کی تھی۔ اس بداعمالی کے پیچھے بھی ایسی ہی ایک وجہ تھی جس کی پیشگوئی راجہ داہر کو نجومیوں نے کی تھی کہ اس کی بہن سے شادی کرنے والا مستقبل میں اس علاقے اور خطے کا حاکم بنے گا اور تمام دولت و جائیداد کا بااختیار مالک بھی ہوگا۔ اس اقتدار، حاکمیت اور دولت کے لالچ کے باعث راجہ داہر نے اپنی بہن سے خود شادی کر لی۔ ایک راجہ کے ایسا کرنے کی وجہ سے اس خطے کے اکثر جاگیرداروں نے اس روش کا اختیار کیا۔ مسلم جاگیرداروں نے محرم کے ساتھ نکاح کو خوف خدا کے باعث حرام قرار دیتے ہوئے رد کر دیا مگر قرآن کے ساتھ اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح کر کے اپنے اس مسئلے کا حل نکالا۔ اس طرح کی معاشرتی زیادتی جدید زمانے میں مختلف روپ دھارے آج بھی موجود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شادی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ اس متعلق رائج معاشرے کی رسم و رواج کی جھلک افسانہ ''آسٹروٹرف'' اور افسانہ ''کفن سے انکاری'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

انوار احمد کے افسانوں میں مقامی زبان اور لب ولہجہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مقامی زبان سرائیکی میں بھی افسانے لکھے ہیں مگر اردو افسانہ نگاری میں بھی کہیں سرائیکی زبان کے الفاظ انوار احمد کے ہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی معاشرت میں بسی توہم پرستی کو ہم افسانہ ''کہانی اور کہر'' میں دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملتان میں مزارات اور خانقاہیں بہت ہیں۔ یہ قدیم سلطنت اولیاء کا شہر کہلاتی ہے۔ مگر ان مزارات سے عقیدت اور تعظیم کو معاشرے میں بسے منافق لوگوں نے منفی روپ دے دیا ہے۔ توہم پرستی اس قدر رواج پا چکی ہے کہ نچلا غریب طبقہ جو اپنے لباس، خوراک اور چھت جیسی بنیادی ضروریات پوری نہیں کر پاتا وہ اپنی آمدنی کی خطیر رقم ان خانقاہوں پر نذرانہ دے دیتا ہے۔

> ''اس کے بعد کہانی ایک خانقاہ پر پہنچی، جہاں وہ غٹرغوں کرتا کبوتر بن گئی، اس نے دیکھا کہ مزار پر قیمتی غلاف چڑھے ہیں اور دعا مانگنے والوں، گریہ کرنے والوں کے تن پر چیتھڑے ہیں، سارے حاجت مند ساہوکاروں کی طرف سے دی ہوئی پوٹلیاں مزار کے سرہانے رکھتے جاتے ہیں اور اس کے عوض کنواری بیٹی کے سفید بالوں میں ڈالنے کے لیے سرخ دوپٹہ، بانجھ ماں کے لیے بیٹا، دشمن کے لیے بربادی، شوہر کے لیے صراط مستقیم، ساس کے لیے موت، بہو کے لیے سوت، پڑھے لکھے

کے لیے نوکری اور ان پڑھ کے لیے ویزا مانگ رہے تھے، گڑگڑا کے، رو رو کے، پھر یہ ہوا کہ رات کے پچھلے پہر قبر کو جنبش ہوئی، اس کے دو حصے ہو گئے۔ تہہ خانے میں سے ایک شخص نے نکل کر ساری پوٹلیاں سمیٹیں اور قبر کے اندر چلا گیا۔ کہر نے پوری خانقاہ کو گھیرے میں لے لیا۔''(۹)

اس کہانی میں دوسری جانب انوار احمد نے معاشرتی رویے کو بھی بیان کیا ہے۔ انوار احمد نے معاشرے کے مختلف کرداروں کو اٹھا کر ان کی زندگی کے حالات اور ان پہ اثر انداز ہونے والے عوامل حقیقت پسندانہ انداز میں تحریر کیے ہیں۔ معاشرتی برائیوں کے خلاف بے رحمی سے سچ اگلا ہے۔ اردو ادب میں حقیقت پسندانہ انداز میں سفاک بیان جیسا منٹو کے ہاں ملتا ہے بالکل ویسے انوار احمد نے معاشرتی زندگی کا پوسٹ مارٹم سفاکی سے کیا ہے۔ خاص طور پر معاشرتی برائیوں کے حوالے سے دیکھیں تو افسانوں میں کوئی کردار منشیات کا عادی ہے، کوئی کہانی جنس نگاری میں لپٹی ہے، کہیں توہم پرستی دکھائی دیتی ہے اور کہیں رشوت کا بازار گرم ہے۔ درحقیقت یہ انوار احمد کی قوت مشاہدہ بھی ہے اس کی عکس بندی افسانہ ''درخواست گزاروں کا میلہ'' اور ''حلفیہ بیان'' میں کی گئی ہے اور حقیقت میں آج بھی ملتان کے اکثر فٹ پاتھ پہ ایسے منشیات کے عادی افراد دکھائی دیتے ہیں جو معاشرتی بے راہ روی کا شکار ہو کر ایسی جگہوں پہ زندگی گزارنے پہ مجبور ہیں۔

افسانہ ''گونگی غراہٹ'' معاشرتی برائیوں کے حوالے سے انوار احمد کا بہترین افسانہ ہے۔ جس کے مرکزی کردار خواجہ حاجی کو شرابی، زانی اور اسمگلر دکھا کر معاشرے میں پھیلی برائیوں کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ معاشرے میں پھیلا معاشی استحصال، طبقاتی اونچ نیچ اور اس طبقاتی فرق کے باعث پیدا ہونے والی برائیاں اس کہانی میں عیاں ہیں۔ مرکزی کردار ایک معاشرتی ناسور کے طور پہ دکھائی دیتا ہے جو نا صرف معاشرتی برائیوں کی جڑ ہے بلکہ امیر ہونے کی وجہ سے معاشرے کے اعلیٰ طبقے اور سیاسی حلقوں میں ایک معزز اور اعلیٰ کردار کا حامل شہری جانا جاتا ہے۔ امیری اور دولت نے حقیقی مکروہ چہرے کو چھپا دیا ہے۔ انوار احمد نے خواجہ حاجی کے ذریعے معاشرے کے معزز امراء کی شخصیت اور کردار کے پیچھے چھپے منافق، اخلاقیات سے عاری اور دوغلے چہرے کو ہمارے سامنے عیاں کیا ہے۔ اس کے بعد جنسی جبلت اور جنس نگاری کے حوالے سے بھی افسانہ نگار کا قلم اس کہانی میں بے رحمی سے استعمال ہوا ہے۔

''حاجی خواجہ کی طرح اس کے گھر والے بھی انسان دوست اور دریا دل ہیں۔ حاجی خواجہ کی چاروں بیویاں گھر کے نوجوان ملازموں کو حقارت کے بجائے محبت سے دیکھتی ہیں۔ اور راتوں کو ان کے بدبودار کپڑوں کی میلی جیبوں میں معطّر اور اُجلے نوٹ ٹھونستی رہتی ہیں۔ حاجی خواجہ کی بیٹی سے اپنے خوبصورت ٹیوٹر کی معاشی پریشانیاں برداشت نہیں ہوتیں، حاجی خواجہ کے بیٹوں کا وظیفہ اس شہر کے طوائفوں کی کفالت نہیں کر سکتا۔''(۱۰)

ہر خطے کی سیاسی صورتحال معاشرے کے ساتھ لکھنے والوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ انوار احمد چونکہ بچپن سے ہی ادبی ذوق اور مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں شعور سنبھالا اس وقت آمریت کا غلبہ تھا۔ انوار احمد تخلیق کے لحاظ سے ابتداء میں رومانوی رجحان رکھتے تھے مگر جب جمہوریت کے نام پر محترمہ فاطمہ جناح کو ۱۹۶۵ء میں جنرل ایوب خان نے دھونس اور دھاندلی سے شکست دی تب سے جمہوریت نے انوار احمد کی تحریروں میں محبوبہ کا روپ دھار لیا اور پھر

افسانہ نگاری میں بھی انوار احمد کی قلمی مزاحمت آمرانہ ہتھکنڈوں کے خلاف رہے۔ ایسے لکھاریوں کو ذوالفقار علی بھٹو نے جمہوری نظام کے پرچار کا خواب دکھا کر اس کی تعبیر کے لیے منزل دکھائی۔ پھر ضیاء الحق کا مارشل لاء، بھٹو کی گرفتاری اور پھر پھانسی نے جمہوریت کا خواب سجانے والے ادیبوں کی فکر اور فن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس وقت انوار احمد روشن دماغ رکھنے والے باشعور ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس دور کی سیاسی ابتری مقامی آدمی کی مزاحمت، معاشرتی اصلاح، انقلاب اور تبدیلی کی صورت میں انوار احمد کی تحریروں میں دکھائی دی۔ افسانہ ''چرم ہائے قربانی''، ''درداں دی ماری دلڑی علیل اے''، ''آخرت ایکسپریس''، ''حلفیہ بیان''، ''جب راج کرے کی خلق خدا''، ''یرغمالی''، ''ناقابل شکست''، ''کمال بستی جبڑا چوک''، ''بیچ والا آدمی''، ''بچھوؤں کے ساتھ رات''، ''ایک ہی کہانی'' اور ''پہلا محبّ وطن بچہ'' ایسے افسانے ہیں جو مقامی معاشرت پر اثر انداز ہونے والے ملکی اور سیاسی حالات کی مزاحمت میں تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ مگر علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مارشل لاء کی وجہ سے معاشرتی ابتری افسانہ ''پہلا محبّ وطن بچہ'' میں عکس بند ہے۔

> ''اس شہر خرابی کے لوگ خوش تھے کہ ایک دو ماہرین آثار قدیمہ نے اُن کی سخت جانی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ شہر چھ ہزار برسوں سے مسلسل آباد ہے، اب کہنے کو تو وہ شہر بہت سے معاملات میں خود کفیل تھا۔ کھیس دری سے لے کر عصمت دری تک، اخبار، ریڈیو سے لے کر چرس افیون تک، ادیبوں، شاعروں سے لے کر خون بیچنے والوں تک، تعلیمی اداروں سے اکھاڑوں تک، تفریح گاہوں سے قبرستانوں تک اور سورج طلوع کرنے والی کوٹھیوں سے لے کر شعاع کو ترسنے والی گلیوں تک، مگر اسے یوں محسوس ہوتا، جیسے ہر چیز میں اصل چیز نکل گئی ہو۔ بدن، روح کو، اور مکاں، مکیں کو ترستے ہوئے!''(۱۱)

درحقیقت سیاسی ابتری کے مقامی زندگی پر اثرات کے حوالے سے انوار احمد کے تجربات گوناگوں ہیں۔ انوار احمد نے بطور مقامی آدمی نا صرف تلخ حالات کی کڑواہٹ کا مزہ چکھا ہے بلکہ زندگی کے ہر زہر کو خود گھونٹ گھونٹ پیا ہے۔ تبھی افسانوں میں معاشرتی تلخ حقائق طنز کی کاٹ میں بیان ہوئے ہیں۔ انوار احمد نے ملکی سیاسی حالات کی ابتری کے زمانے میں آمرانہ ہتھکنڈوں کا جبر خود سہا ہے کہ جب لکھاریوں کی اصلاحی اور انقلابی تحریروں پر پابندی لگا دی گئی تھی اور تمام لکھنے والوں کے لیے ریاست یا حکومت کے خلاف لکھنا غداری قرار دے دیا گیا۔ ایسے حالات میں حکومتی جبر سے اپنی مرضی کی سوچ اور افکار کو پروان چڑھانے کے لیے مقامی آدمی کی خود کار سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کر لیا گیا۔ عام آدمی سے اظہار رائے کی آزادی چھین لی گئی۔ اس وقت ایسے باضمیر، فلسفی، دانشور اور مثبت سوچ رکھنے والے ادیب جو حق کا ساتھ دیتے اور باطل کے خلاف آواز اٹھاتے، ان کے خلاف کھلم کھلا دشمنی مول لی جانے لگی تو ان حالات میں انوار احمد نے مقامی آدمی کے احساسات کو استعاراتی روپ میں مگر مزاحمت کرتے عکس بند کیا۔

> ''وہ کچھ دیر اس منظر کو دیکھ کر اداس بیٹھا رہا اور پھر سوچنے لگا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایسی اندھی رات چپکے سے اس کے شہر پر سے گزر جاتی۔ اسی لمحے اس پر گالیوں، مکوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے چند کڑکتی آوازیں سنیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس

حرامزادے کو سوچتے دیکھا ہے۔''(۱۲)

ملکی سیاسی حالات کے تناظر میں لکھے جانے والے انوار احمد کے افسانے درحقیقت قاری کے لیے مزاحمت کی راہ پیدا کرتے ہیں۔اس دور میں مقامی معاشرت کو نسل در نسل بچانے کے لیے حوصلے اور امید کی ضرورت تھی جسے ادیبوں میں سے انوار نے بھی اس طرح کی کہانیاں لکھ کر پورا کیا۔حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور حوصلہ دینے کے لیے ہم انوار احمد کو اپنے افسانوں میں مقامی آدمی کے لیے امید کا دیا روشن رکھتا دیکھتے ہیں۔

انوار احمد نے معاشرتی اقدار کی پامالی اور اخلاقی زوال کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس کے پیچھے وہ معاشرے میں طبقاتی تقسیم اور معاشی تنگ دستی کو وجہ قرار دیتے ہیں۔افسانہ نگار کے نزدیک معاشرے کی طبقاتی تقسیم درحقیقت معاشرتی زوال کی بنیادی وجہ ہے۔جیسا کہ افسانہ ''نوں جی'' میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ معاشی اور اقتصادی مجبوریاں ہی ہیں جو ایک جوان لڑکی کو جسم فروشی کی راہ پر لگا دیتی ہیں۔ایک رکشہ چلانے والا بھلے ایمانداری اور پاکبازی کا مظاہرہ کر رہا ہے مگر اس کا لڑکی کی مجبوری اور ذلت کو نظر انداز کر کے اس کے اتارے کپڑے اٹھا کر فرار ہو جانا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ بنیادی ضروریات جنسی جبلت پر حاوی ہیں اور معاشی تنگ دستی انسانی نفسیات کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔اس افسانے کی کہانی شروع سے آخر تک قاری پہ تجسس کی سی کیفیت قائم رکھتی ہے مگر اس کا اختتام معاشرے کی تنگ دستی کی مثال ہے۔

''کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگا "باؤ جی! میں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ پچاس پیسے کم دے گئی ہے اور میرے گھر میں کھانے والے نوں جی ہیں۔''(۱۳)

ہمارے معاشرے کا غربت کا مارا نچلا طبقہ مفلسی اور تنگ دستی کے باعث روٹی کو ترستا ہے۔تن ڈھانپنے کے لیے لباس کی ضرورت کسی حد تک پوری کر بھی لے تو ان کے بچے ننگے پاؤں سکول جانے پہ مجبور ہوتے ہیں۔ہمارے معاشرے کے ایسے مفلس لوگوں کے حال اور مستقبل کے متعلق کوئی منصوبہ بندی یا پلان نہیں ہوتے بس زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔بچپن میں بھوک کا احساس لیے، جوانی میں بے روزگاری، لڑکیاں شادی کے لیے اچھے رشتے کا انتظار کرتے اور بڑھاپے میں کسی بیماری میں مبتلا ہو کر زندگی جینے کی کوشش کرتے ہیں۔دوسری جانب معاشرے میں ہر دوسرا شخص منافقت کا لبادہ اوڑھے اپنے سے کم تر، کمزور اور نچلے درجے کو دبائے رکھنے کا رجحان رکھتا ہے۔افسانہ ''بچھوؤں کے ساتھ رات'' میں افسانہ نگار ایسی صورتحال کو سامنے لاتا ہے کہ معاشرے کا نچلا طبقہ مفلسی اور تنگ دستی کے باعث بے حس اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو چکا ہے۔اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے، گھر بار چلانے کے لیے جتن کرتے اس بات سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ملکی حالات کیسے ہیں؟ حکومت کا تختہ الٹ چکا ہے یا نئی آنے والی حکومت کس طرح کی ہے؟ ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ جنگ ہو یا امن ہر طرح کے حالات میں ایسے لوگوں کو بس اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔انوار احمد نے مقامی معاشرت سے تعلق رکھنے والے ایسے نچلے طبقے کے ان مسائل کی وجہ طبقاتی نظام کو قرار دیا ہے اور اس کے تحت پیدا ہونے والی معاشرتی ناہمواریوں کو ہم افسانہ ''درداں دی ماری دلڑی علیل اے'' میں بھی دیکھتے ہیں۔اس کہانی میں ایک طرف بھٹو کے دور کی سیاسی صورتحال کو موضوع بنایا گیا ہے دوسری جانب مقامی معاشرت میں طبقاتی درجہ بندی اور معاشی تنگ دستی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔معاشرے کے دو مختلف طبقات کے معیار زندگی کا موازنہ خوبصورتی سے کیا

گیا ہے۔ طبقاتی درجہ بندی کے باعث نظام تعلیم میں بھی عدم مساوات دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کہانی میں طبقاتی تقسیم کا موازنہ کرنے کے لیے تعلیمی شعبے کا چناؤ انوار احمد کے پختہ فنی شعور کو ظاہر کرتی ہے۔ معاشرے میں تمام بچے یکساں تعلیم کا حق رکھتے ہیں مگر انوار احمد نے اس معاملے میں نچلے طبقے کی محرومیوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔

> ''اُجلے کپڑوں میں پھول جیسے بچے، ایک ہاتھ میں خوبصورت بستہ اور دوسرے میں شاداب ٹفن جُھلاتے ہوئے برآمد ہوئے تو ڈرائیوروں نے چیتھڑوں میں ملبوس مکروہ چہروں والے غلیظ بچوں کو بھنبھناتی مکھیاں سمجھ کر بھگا دیا، جو چیتھڑوں کی بھی دھجیوں کو ہاتھ میں لے کر، موٹر کاروں کے شیشوں کو چُھونے کے بہانے یا ان پر تھوکنے کی تمنا میں انہیں صاف کرنے آئے تھے، جس طرح خوبصورت شہروں کا حسن کچی آبادیوں نے غارت کیا ہے، اسی طرح ایک چمکیلے روشن منظر میں یہ بدنما لکیریں تھیں۔''(۱۴)

انوار احمد کا بچپن غربت و افلاس میں گزرا ہے ایسے میں ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لکھے گئے افسانوں کی کہانیوں کا خمیر انوار احمد نے اپنے حالات زندگی اور اپنی مقامی ماحول سے حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ فنی لحاظ سے انوار احمد افسانہ نگاری میں تمام فنی وسائل کو استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ افسانے قصہ پن کی خوبی سے مزین افسانہ نگار کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں۔ موضوع اور کردار بھی مانوس فضا سے اخذ کیے معلوم ہوتے ہیں جنہیں کہانی میں سمو کر معاشرے کے کسی نہ کسی تاریک پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ فکری لحاظ سے ہم انوار احمد کو زیادہ تر استحصال انسانی کے خلاف الجھتا، للکارتا اور مقامی زندگی کی بقا کے لیے جنگ لڑتا دیکھتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں دردمند افسانہ نگار کے طور پر معاشرے کی محرومیاں اور مسائل سامنے لاتا ہے اور ترقی پسند نظریہ رکھتے ہوئے مقامی لوگوں کو اپنے حقوق، اپنی دھرتی، زمین اور مقامی معاشرت کو پہچاننے کا احساس اور بچانے کی کوشش کرنے کی ترغیب دیتا دکھائی دیتا ہے۔ جب ہم ملتان کی سیاسی، تاریخی اور معاشرتی پہلو کا مطالعہ کریں تو ہم اس بات سے قطعی انکار نہیں کر سکتے کہ انوار احمد اردو افسانوی ادب میں مقامی معاشرت کا ترجمان ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جنوبی پنجاب کے نامور افسانہ نگار انوار احمد کا تعلق ملتان سے ہے۔ انوار احمد کا خاندان پاکستان بننے سے پہلے ہی ملتان آبسا تھا جہاں ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو مختار احمد کے ہاں انوار احمد کی پیدائش ہوئی۔ تعلیمی سلسلہ بھی ابتداء سے اخیر تک ملتان میں جاری رہا۔ ملازمت کا آغاز کوئٹہ ڈگری کالج سے بطور اردو استاد ہوا۔ اس کے بعد خواجہ فرید کالج رحیم یار خان، ایمرسن کالج ملتان میں اردو کے استاد رہے۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہاں شعبہ اردو میں لیکچرار بھرتی ہوئے۔ ۱۹۸۵ئمیں اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسسٹنٹ پروفیسر بن گئے۔ پھر ترقی کرتے ہوئے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر بنے۔ شعبہ اردو کے چیئرمین اور ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز بھی رہے۔ اس جامعہ کے علاوہ ملکی سطح پر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، یونیورسٹی آف گجرات (سیالکوٹ کیمپس) اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں بطور صدر نشین خدمات انجام دیں۔ بین الاقوامی سطح پر ترکی کی انقرہ یونیورسٹی اور جاپان کی اوساکا یونیورسٹی میں اردو کے استاد کے طور پر خدمات سر انجام دے چکے ہیں۔ اردو زبان وادب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دینے والے انوار احمد کو ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی کی جانب سے پانچ مرتبہ سالانہ ''نیاز فتح پوری ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۰ء میں HEC کی جانب سے آپ کو بہترین اردو استاد کا ایوارڈ بھی ملا۔ ۲۰۰۸ء میں حکومت پاکستان نے ''صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی'' سے نوازا۔ پہلا افسانہ ''کتب خانے میں لاش'' کے عنوان سے لکھا۔ اس کے بعد ''امر'' لکھا جو شائع ہونے والا انوار احمد کا پہلا افسانہ تھا۔ یہ ۱۹۶۵ء میں ماہنامہ نخلستان میں شائع ہوا۔ اب تک چالیس سے زائد افسانے لکھ چکے ہیں۔ انوار احمد کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''ایک ہی کہانی''، دوسرا مجموعہ ''پہلے سے سنی ہوئی کہانی''، تیسرا مجموعہ ''آخری خط'' اور چوتھا مجموعہ ''ملتان آرکائیوز میں عاشقوں کے مکتوب کے عنوان سے شائع ہوا۔ افسانہ نگاری کے علاوہ انوار احمد کالم نگار، خاکہ نگار، محقق، نقاد اور مرتب بھی ہیں۔ تحقیق وتنقید میں انوار احمد کا گراں قدر کارنامہ ''اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ'' ہے جس کے تین ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ انوار احمد، آخری خط، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص ۱

۳۔ ایضاً، ص ۳۸۔۳۹

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۵۔ ایضاً، ص ۹۸

۶۔ انوار احمد، ایك هی كهانی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۹

۷۔ ایضاً، ص ۲۱

۸۔ انوار احمد، آخری خط، ص ۱۱۸

۹۔ ایضاً،ص۵۹

۱۰۔ انوار احمد، ایک ہی کہانی،ص۳۷

۱۱۔ انوار احمد، آخری خط،ص۲۳

۱۲۔ ایضاً،ص۲۴

۱۳۔ ایضاً،ص۱۵

۱۴۔ ایضاً،ص۲۸